ڈاکٹر ذاکر الٰہی چودھری کی انتظامی صلاحیتیں

ڈاکٹر ابراہیم شیخ

کبھی کوئی شخص اپنے ادارے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے تو کبھی کسی شخص کی وجہ سے ایک ادارہ جانا پہچانا جاتا ہے۔ شہر بمبئی میں صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ اور ڈاکٹر ذاکر الٰہی چودھری کو کون نہیں جانتا۔ صابو صدیق کالج میں آٹو موبائل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اور ڈاکٹر ذاکر الٰہی چودھری ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ ہمارے شعبے میں اے (A) سے لے کر زیڈ (Z) تک سبھی کچھ موجود ہے۔ آٹو موبائل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ اے (A) سے شروع ہوتا ہے مگر زیڈ (Z) پر ختم ہوتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر ذاکر الٰہی چودھری کو ہم سبھی لوگ کالج میں ذاکر صاحب یا ذاکر سر یا زیڈ آئی (ZI) سر کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

ذاکر صاحب سے میری پہلی باضابطہ ملاقات فروری 2003 میں صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ کے شعبہ آٹو موبائل انجینئرنگ میں بطور لکچرر جوائن کرنے کے بعد ہوئی۔ پہلے ہی ملاقات میں انہوں نے اتنی ساری شفقت مجھے دی کہ اپنی شخصیت مجھے بھاری بھرکم دکھائی دینے لگی۔ آیئے میں آپ کو ذاکر صاحب کی شخصیت سے روبرو کراؤں:

سنتے رہے ہیں آپ کے بارے میں سب سے ہم
ملنے کا آج آپ سے موقع ہمیں ملا

لمبا قد، گورا رنگ، کشادہ پیشانی، بھرواں لمبی داڑھی، نوکیلی ناک پر ماڈرن فریم والا چشمہ، شیروانی والا لباس، پاؤں میں جوتا یا چمڑے کی سینڈل، ارادے میں اورنگ زیبی ضد، چہرے پہ غضب کا اعتماد اور وقار کا ملا جلا رنگ۔ ان سب اوصاف کے ساتھ ذاکر صاحب ایک ضخیم شخصیت کے مالک ہیں۔

آپ کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم مظفرنگر اترپردیش میں ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ٹیک اور ایم ٹیک کی اعلی تعلیم حاصل کی۔ معاش کی تلاش میں سب سے پہلے حیدرآباد کے دکن کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں لگ بھگ تین سال تک بطور لیکچرر درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

حیدرآباد کے بعد بمبئی آنا ان کا مقدر تھا۔ جو 1992 میں بمبئی کے مشہور و معروف انجمن اسلام کے صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ میں لیکچرر کی حیثیت سے شعبہ آٹو موموبائل انجینئرنگ جوائن کیا۔ یہ دور صابو صدیق کالج کا بہت ہی زریں دور تھا۔ ڈاکٹر کے حسین صاحب پرنسپل تھے اور کالج کے سبھی شعبوں میں ایک سے بڑھ کر ایک تعلیم یافتہ پروفیسرز کی بھرمار تھی اور کالج اپنے پورے عروج پر تھا۔

صابو صدیق کالج سے ذاکر صاحب کے مراسم کافی گہرے ہیں اور اس کی تاریخ تقریباً بتیس برس کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ انہوں نے صابو صدیق کالج کے آٹو موبائل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ کے ایک نہایت زریں دور کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس دور کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حتی المقدور حصہ بھی لیا۔

ذاکر صاحب میں انتظامی صلاحیتیں غضب کی ہیں۔ شروع میں انہیں ایک سال کے لیے ڈپارٹمنٹ کا کوارڈینیٹر بنایا گیا۔ بعد ازیں انہی صلاحیتوں کی بنا پر تقریباً 14 سال تک ڈپارٹمنٹ آف آٹو موبائل انجینئرنگ کے ہیڈ رہے۔ اس دور میں ڈپارٹمنٹ کو کامیابیوں اور بلندیوں پر پہنچانے کے لیے بے پناہ محنت اور کوششیں کیں۔

ذاکر صاحب کی سرپرستی میں 2002 میں پہلی بار آٹوموٹیویشن (AUTOMOTIVATION) کے نام سے ان کے شعبے میں ایک شاندار پروگرام منعقد کیا۔ اس پروگرام کے مختلف حصوں میں شرکت کے لیے آٹوموٹیو انڈسٹری کے اعلی افسران اور ٹیکنوکریٹس بھی موجود تھے۔ اسی پروگرام میں پہلی بار ممبئی کی سطح پر بڑے پیمانے پر کار ریلی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ آٹوموٹیویشن مسلسل 2002 سے لے کر 2006 تک بڑی کامیابی کے ساتھ چلتا رہا، جس میں 2003 سے اس ناچیز نے بھی اپنا تعاون پیش کیا۔ ان سبھی پروگرام کے دوران ذاکر صاحب کی قیادت اور سبھی اسٹاف ممبران اور طالب علموں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی دیکھتے ہی بنتی تھی۔

لگ بھگ اسی عرصہ کے دوران ایک اور بڑا اعزاز ہمارے ڈپارٹمنٹ کو میسر ہوا۔ آٹو موبائل انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ نیشنل بورڈ آف ایکریڈیٹیشن (NBA) کے ذریعے تسلیم شدہ پہلا محکمہ تھا، جس کو پانچ سال کے لیے ایکریڈیٹیشن ملا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ اعزاز یوں ہی نہیں مل گیا تھا۔ سبھی اسٹاف ممبران اور ذاکر صاحب نے ایکریڈیٹیشن کے لیے دن رات محنت کی تھی۔ ڈپارٹمنٹ میں موجود ہائی ٹیک مشین اور ایکوپمنٹ کے علاوہ محنتی اور کوالیفائیڈ اسٹاف نے چار چاند لگا دیے تھے۔ ایگزٹ میٹنگ کے دوران این بی اے (NBA) نے بذات خود ہمارے ڈپارٹمنٹ کے اسٹاف کو ”ینگ اور ڈائنامِک اسٹاف“ کے لقب سے نوازا۔ سبھی اسٹاف ممبران کی محنت اور ذاکر صاحب کی کاوشوں اور ان کی انتظامی صلاحیتوں کو سراہا۔ نتیجتاً ہمارا ڈپارٹمنٹ ممبئی یونیورسٹی میں پہلا ڈپارٹمنٹ تھا، جس کو پانچ سال کے لیے ایکریڈیٹیشن ملا تھا۔

> **ذاکر صاحب میں انتظامی صلاحیتیں غضب کی ہیں۔ شروع میں انھیں ایک سال کے لیے ڈپارٹمنٹ کا کوآرڈینیٹر بنایا گیا۔ بعد ازیں انھی صلاحیتوں کی بنا پر تقریباً 14سال تک ڈپارٹمنٹ آف آٹو موبائل انجینئرنگ کے ہیڈ رہے۔ اس دور میں ڈپارٹمنٹ کو کامیابیوں اور بلندیوں پر پہنچانے کے لیے بے پناہ محنت اور کوششیں کیں۔**

کالج میں ہر شخص اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ذاکر صاحب ایک فعال ترین شخصیت ہے۔ ان کی تعلیمی، سماجی اور فلاح و بہبود کی کارکردگی کی فہرست بڑی طویل ہے۔ دراصل اگر آپ انہیں مجلسی ہستی کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ہمیشہ کسی نہ کسی دینی، تعلیمی، سماجی اور فلاحی کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور لوگوں کی بڑی خدمت کرتے ہیں۔ دعوت کے کام سے ایک مدت سے منسلک ہیں۔ دنیاوی اور اُخروی زندگی کا ایک بہترین توازن بنائے رکھا ہے۔ بہت سارے اسکولوں، تنظیموں اور ٹرسٹ کے انتظامیہ میں ہیں۔ کہیں پر بحیثیت صدر، کسی میں ٹرسٹی، کہیں پر بحیثیت ممبر، کہیں پر چیئرمین یا وائس چیئرمین کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود اپنی صلاحیتوں سے ان تمام اسکولوں اور تنظیموں کی ترقی میں بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں اور سبھی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

کالج کی سطح پر اپنی تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے بعد انہوں نے ممبئی یونیورسٹی میں بھی صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ کی نمائندگی کی ہے۔ 1999 سے 2005 کے دوران 2005 کے دوران ممبئی یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں میں بطور ممبر ذمہ داریاں نبھائیں۔ بحیثیت کوآرڈینیٹر آٹو موبائل انجینئرنگ کورس کا نصاب تیار کیا۔ چھ سال کے لمبے وقفے کے لیے یونیورسٹی میں مرکزی تشخیصی عمل کے رابطہ کار (کیپ کوآرڈینیٹر) کی حیثیت سے کالج کی نمائندگی کی۔ اتنا ہی نہیں یونیورسٹی کے سیمسٹر امتحانات کے دوران جوائنٹ چیف کنڈکٹر (JCC) کی حیثیت سے دوسرے کالجوں میں ڈیپوٹیشن پر رہے اور اپنی ہر ذمہ داری کو بدرجہ اتم نبھایا۔

بقول از خود، ذاکر صاحب نے تقریباً بیس سالوں تک جیل کی ہوا کھائی ہے۔ صابو صدیق کالج کے اسٹاف کوارٹرز کے تیسرے منزلہ کا وہ مکان جو انہیں الاٹ کیا گیا تھا، اس کی کھڑکیاں سیدھے بائیکلہ جیل کی جانب کھلتی تھیں۔ ناگپاڑہ جیسے تنگ علاقے میں ہونے کے باوجود اُن کے گھر میں دِن بھر جیل کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں آیا کرتی تھیں۔ ذاکر صاحب کے گھر دعوت ہونے پر ہم نے بھی بائیکلہ جیل کی ہوا کھائی ہے اور کھانے کے ساتھ بہت لطف اٹھایا ہے، لہٰذا کئی سالوں تک نسیم بری کا مزہ لینے کے بعد آج کل وہ نسیم بحری کا لطف اٹھا رہے ہیں۔

ذاکر الٰہی صاحب کھانے کے بڑے شوقین ہیں اور مہمان نوازی اُن کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے اس مشغلے میں اہل خانہ بھی برابر شریک رہتے ہیں۔ کوئی مہمان یا رشتہ دار اگرچہ ان کے گھر پہنچ جائے تو گھر والوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ چاہتے ہیں کہ کیا کچھ نہ کھلائیں اور کتنی خاطر کریں۔ مہمانوں کے سامنے سوکھے میوے اور پھلوں کی پلیٹ رکھ کر خود پھلوں کو کاٹنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کو اِتنی نفاست سے کاٹتے ہیں کہ ایک جگہ چاقو لگا کر سارے چھلکے کو بیک جنبش قلم اتار دیتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو پھل کاٹتے ہوئے دیکھنا بھی بڑا پُر مسرت ہوتا ہے۔ میں نے اور میرے پروفیسر ساتھیوں نے ذاکر صاحب کے گھر پر جتنی ضیافتیں اڑائی ہیں، اتنی شاید ہی کسی اور ساتھی کے یہاں اڑائے ہوں۔

اپنے گھر میں اُن کی حیثیت ایک دوست، ایک مہذب شوہر، ایک والد اور ایک شفیق نانا اور دادا کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ذاکر صاحب بڑے سیر چشم، کثیر الاحباب اور کنبہ پرور آدمی ہیں۔ اپنے اہل خانہ، بچوں اور بچوں کے بچوں سے تو بے حد محبت اور شفقت رکھتے ہیں، دور کے رشتہ دار ہوں یا قرابت دار، اپنے علیگ ساتھی ہوں یا کالج کے رفقا، دعوت کے کام کے ساتھی ہوں یا سماجی دائرہ کار کے رفقا، سبھی کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ آئے دن گھر میں ضیافتوں کے دور چلتے رہتے ہیں۔

ان کا حافظہ ماشاءاللہ غضب کا ہے۔ اُنھیں نہ صرف اپنی بتیس سالہ زندگی، جو انھوں نے صابو صدیق کے لیے وقف کی ہے، ایک ایک بات یاد ہے۔ بلکہ اپنی طالب علمی، گاؤں اور علی گڑھ میں گزارے ہوئے ایک ایک لمحے یاد ہیں۔ جب سنانے پہ آتے ہیں تو بہت مزے لے کر ہم سب کو سنایا کرتے ہیں۔ اپنے یادوں کے خزانے سے بیش بہا قیمتی اور چمکدار موتیوں سے ہمیں نوازتے رہتے ہیں۔

ذاکر الٰہی صاحب ایک جہاں دیدہ اور مردُم شناس آدمی ہیں۔ کسی بھی شخص کو پہلے ہی ملاقات میں پرکھ لیتے ہیں۔ علی گڑھ سے بمبئی آنے والے علیگ برادران میں ذاکر صاحب سے پہلے مرحوم ڈاکٹر دستگیر عالم صاحب (سابق پروفیسر برہانی کالج) کے علاوہ اور کئی دیگر احباب نے بمبئی کو اپنی جائے قیام بنایا لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت نمایاں ہی رہی۔ بمبئی آنے کے بعد کسی نے ٹوپی چھوڑی تو کوئی شیروانی اور ٹوپی سے پیچھا چھڑا کر پینٹ شرٹ پہننا شروع کر دیا اور پورے ’بمبیا‘ ہو گئے۔ مگر دستگیر عالم صاحب کی طرح ذاکر الٰہی صاحب کی شخصیت آج بھی علی گڑھ کی تہذیب کی مکمل آئینہ دار ہے۔

یہ ان کی بڑائی ہی تو ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں اور سبھی کو عزیز رکھتے ہیں۔ چاہے ڈاکٹر احرار احمد ہوں، پروفیسر فرحین بوبیرے ہوں، پروفیسر نفیس احمد خان یا پھر پروفیسر سید احمد ہو یا بذات خود ہم۔ ہم سبھی سے ذاکر صاحب بہت شفقت رکھتے ہیں۔ ہم سبھی سے ذاکر صاحب کا شعبانہ تعلق ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی شعبوں سے ان کے ہم عصر ہے پروفیسر آصف انصاری، پروفیسر محمد رفیع خان صاحب، پروفیسر جاوید تیلی صاحب، ڈاکٹر محمد احمد یہ سبھی ذاکر صاحب کی بڑی عزت کرتے ہیں اور ان کی بے پناہ صلاحیتوں کا لوہا مانتے ہیں۔ ڈاکٹر احرار احمد، پروفیسر آصف انصاری اور پروفیسر محمد رفیع خان صاحب انھیں اپنا بڑا بھائی اور محسن مانتے ہیں اور بڑا ادب واحترام کرتے ہیں۔ ذاکر صاحب بھی اُنھیں اپنی شفقتوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ بمبئی میں شروعاتی دنوں سے ذاکر صاحب اِن سبھی حضرات کے سرپرست رہے ہیں۔ اسی محبت اور شفقت کے چلتے بمبئی میں وہ ذاکر صاحب کے گھر کو اپنا مائیکہ سمجھتے ہیں۔ اپنے مائیکہ میں بلا تکلف سبھی کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات کا اندازہ آپ اِسی بات سے لگا سکتے ہیں کہ کالج میں بہت سے لوگ اُنھیں ظِل الٰہی اور مجھے شیخو سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارا درس و تدریس کے علاوہ کسی انارکلی سے کوئی عشق نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے کبھی ظِل الٰہی کے خلاف معرکہ آرائی نہیں کی۔ لوگ ہمیں بھلے ہی شیخو سمجھتے ہوں مگر ذاکر صاحب تو ہمیں اپنے نورتنوں میں شمار کرتے ہیں۔

وہ میرے کرم فرما ہیں اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ ڈپارٹمنٹ آف آٹو موبائل انجینئرنگ میں اپنا کریئر شروع کرنے کے بعد کئی ایسے موقع میسر ہوئے جہاں مجھے ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اور بہت سارے انتظامی گر سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی تحریر اور تقریر دونوں میں جادو ہے۔ ابتدائی تعلیم ہندی میڈیم سے ہونے کے باوجود اردو اور انگریزی زبانوں پر انہیں بہترین عبور حاصل ہے۔ بذات خود میں نے بھی ان کی سنگت میں ڈرافٹنگ کے کئی گر سیکھے ہیں۔ ڈاکٹر احرار احمد ہو یا دیگر کوئی سٹاف ان سے اصلاح لینے میں کوئی پرہیز نہیں کرتا۔ ہم جو بھی تھوڑا بہت انگریزی میں خط و کتابت کر لیتے ہیں، اصلاح کے لیے آج بھی ذاکر صاحب کے کیبن کا ہی رُخ کرتے ہیں۔

میرے کریئر میں چاہے ماسٹرس آف انجینئرنگ (ME) میں داخلہ لینے کا موقع ہو یا پی ایچ ڈی (PhD) کرنے کا معاملہ ہو ذاکر صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایم ای میں داخلے کے وقت ہمارے پرنسپل صاحب بضد تھے کہ مجھے داخلے کے لیے اجازت دینا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا پرنسپل صاحب کے آفس سے مایوس لوٹنے کے بعد ذاکر صاحب نے میرا اداس چہرہ دیکھا اور مجھ سے اداسی کی وجہ پوچھی۔ جب میں نے اُن سے وجہ بتائی تو فوراً میرے ہاتھ سے ایڈمیشن فارم لیا اور پرنسپل آفس کا رخ کیا۔ تقریباً 15 منٹ بعد جب واپس لوٹے تو میرے ایڈمیشن فارم پر پرنسپل کے دستخط اور پرمیشن دونوں تھے۔

2012 میں جب پی ایچ ڈی (PhD) میں داخلہ لینے کا موقع اور ارادہ ہوا تو انہوں نے اپنے ساتھ پروفیسر احرار احمد صاحب، پروفیسر اکلیم صدیقی اور میرے بارے میں سوچا۔ یہ بات ان کے اعلیٰ ظرف کی دلیل ہے کہ جن سے شفقت رکھتے ہیں انہیں بھی اپنے ساتھ آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں۔

ذاکر صاحب پر ایک دور ایسا بھی آیا جب ادارہ جاتی سیاست کے چلتے انہیں ڈپارٹمنٹ میں صدر شعبہ کے عہدہ سے ہٹایا گیا۔ ان کی جگہ جن کو شعبے کی ذمہ داری سونپی گئی ان کا ایڈمنسٹریٹو کام کم اور ذاکر صاحب پر نگرانی اور جاسوسی کرنا زیادہ تھا۔ جب حالات بدلے تو ڈپارٹمنٹ اور کالج کے وہ لوگ جن پر ذاکر صاحب کے احسانات تھے اور جو لوگ ان کی مہربانی سے شعبے میں تھے اُنھوں نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ ایسے موقع پرست لوگوں نے ان کے خلاف ایک قسم کی معرکہ آرائی شروع کردی۔ یہ لوگ ذاکر صاحب کے تمام احسانات اور تعلقات کو طاق پر رکھ کر وقتی فائدے کے لیے ایسے لوگوں سے جا ملے جن کو ذاکر صاحب کی ترقی اور معیار زندگی سے جلن تھی:

اٹھا لیتا ہے اپنی ایڑیاں جب ساتھ چلتا ہے
وہ بونا کس قدر میرے قد وقامت سے جلتا ہے

صابو صدیق کالج آف انجینئرنگ میں عمر کا ایک لمبا عرصہ وقف کرنے کے بعد ذاکر صاحب ریٹائرمنٹ سے کچھ ہی قدم دور ہیں۔ لیکن ان کے کام کرنے کا تجسس اور توانائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ آج بھی ایک پروفیسر اور منتظم ہونے کے ساتھ ایک محقق اور طالب علم ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسی جرائد میں اپنے معیاری تحقیقی مقالے شائع کرتے رہتے ہیں اور کوشاں رہتے ہیں کہ ہم لوگ بھی اسی طرح کی تحقیقی کاموں میں اپنا وقت اور توانائی صرف کریں۔

بعض بشری کمزوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کے بس میں نہیں ہوتیں۔ ایسی ہی کچھ بشری خامیاں ممکن ہے ذاکر صاحب میں بھی ہوں۔ لہٰذا وہ بھی اس سے مُبرّا نہیں ہے۔ لیکن ان خامیوں سے وہ تمام خوبیاں زائل نہیں ہو جاتیں جو ذاکر صاحب کو ایک بہترین انسان ثابت کرتی ہیں۔ کسی شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریوں کو اپنانا محبت کی دلیل ہوتی ہے۔ ہم سب ذاکر صاحب سے محبت کرتے ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ ہم سب دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی ذاکر صاحب کو لمبی عمر اور صحت سے نوازے اور وہ ہماری سرپرستی اور رہنمائی ہمیشہ کرتے رہیں۔ آمین!! ■

سعادت حسن منٹو اور ماہنامہ ’کنول‘ آگرہ

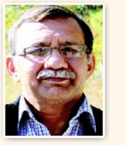

ڈاکٹر اسد فیض

تیس کی دہائی میں لاہور کی طرح ہندوستان میں آگرہ، دہلی اور لکھنؤ اردو زبان کے اہم مراکز خیال کیے جاتے تھے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں لاتعداد ادبی جرائد کا اجرا عمل میں آیا، جنہوں نے اردو زبان وادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اردو کے ادیبوں کو ہندوستان کے طول و عرض میں متعارف کروایا۔ لیکن بعض جرائد چند برسوں تک شائع ہونے کے بعد پردہ خفا میں چلے گئے اور ان کے مندرجات لائبریریوں میں دفن، گرد میں اٹے کسی محقق کی نظرِ کرم کے منتظر رہے کہ وہ انہیں تلاش کریں اور ان کی یادگار تحریروں کو ایکبار پھر منصۂ شہود پر لائیں۔ ایسے ہی جرائد میں ماہ نامہ ’کنول‘ (آگرہ) کا بھی شمار ہوتا ہے جس میں سعادت حسن منٹو کی کئی نگارشات شائع ہوئیں۔ یہ تحریریں اُس کے ادبی سفر کے ابتدائی برسوں کی یادگار ہیں۔

ماہنامہ کنول آگرہ کا اجرا جولائی 1935 میں عمل میں آیا۔ اس کے مدیر منظر صدیقی اکبرآبادی (1971-1909) جو خود ادیب اور سیماب اکبرآبادی کے فرزند اکبر تھے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی (1951-1880) کا شمار علامہ اقبال کے بعد ہندوستان کے مقبول شعراء میں ہوتا ہے۔ اُن کے خاندان نے ہندوستان میں ادبی جرائد کی ایک الگ اور منفرد تاریخ مرتب کی ہے۔ 1924 میں انہوں نے آگرہ سے ایک جریدہ ”پیمانہ“ جاری کیا جو 1925 تک شائع ہوتا رہا۔ پھر 1929 میں ہفتہ وار ”تاج“ کی اشاعت کی بنیاد ڈالی۔ اسی خاندان کی جانب سے 1930 میں آگرہ سے پندرہ روزہ ”شاعر“ کی طباعت کا آغاز ہوا جو بعدازاں ماہنامہ ہوکر ممبئی سے تاحال شائع ہو رہا ہے۔ ”کنول“ بھی سیماب خاندان کی ادبی وصحافتی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ افسوس ہے کہ ہندوستان اور ہمارے ہاں جرائد کی تاریخ وتفصیل سے متعلق شائع ہونے والی کتب میں بھی اس جریدہ کا تذکرہ نہیں ملتا۔

”کنول“ ہر ماہ آگرہ سے 23x33/8 کے سائز میں 62 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں منٹو کی ابتدائی تحریر ایک خط ہے جو ”کنول“ کے ستمبر 1935 کے شمارہ میں صفحہ 4 پر شائع ہوا ہے۔ یہ خط منٹو نے علی گڑھ سے لکھا ہے۔ یہ وہ دور تھا۔ جب منٹو مختصر دورانیہ کے لیے 1935 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ اس وقت وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاسٹل کے کمرہ نمبر 111، ایس ایس ایسٹ میں مقیم تھا۔ منٹو نے بعدازاں مختارالدین آرزو کے نام ایک خط میں اولڈ علیگ ہونے پر فخر اور خوشی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں سے انہوں نے ایڈیٹر کو ”کنول“ کی اشاعت پر مبارکباد اور اس میں چھپنے والی تحریروں کے متعلق پسندیدگی کا خط تحریر کیا ہے۔

”کنول“ میں منٹو کا پہلا مضمون اکتوبر 1935 کے شمارے میں ”انقلابِ فرانس کا آرٹ پر اثر“ صفحہ 32 سے 33 پر شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون فرانس میں انقلاب سے قبل اور بعد میں مصوری کے آغاز وارتقاء پر روشنی ڈالتا ہے اور منٹو کی آرٹ سے دلچسپی اور وابستگی کا مظہر ہے۔

نومبر 1935 کے شمارہ میں فرانسیسی افسانہ نگار تھیوفل گالمیر کے افسانے کا ترجمہ ”بلبلوں کا گھونسلہ“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ دو بہنوں کی کہانی ہے، جنہوں نے اپنی زندگی موسیقی کے لیے وقف کر دی تھی ان کا اوڑھنا بچھونا صرف گائیکی تھی اور وہ اس کے فروغ کی تگ ودو میں موت سے ہمکنار ہوگئیں۔ منٹو کا اسلوب ترجمہ سے زیادہ طبع زاد کہانی کا انداز رکھتا ہے۔ کنول کے دسمبر 1935 کے شمارے میں منٹو کا ایک ڈرامہ ”خودکشی“ صفحہ 25 سے 30 تک شائع ہوا ہے۔ لیکن 1946 میں مطبوعہ منٹو کی کتاب ”کروٹ“ میں اس عنوان سے ایک مختلف ڈرامہ شائع ہوا ہے۔

یہ دو نوجوانوں کے مکالمہ پر مبنی ہے، جن میں سے ایک حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر خودکشی کرتا ہے۔ منٹو نے تقاریر کی مانند طویل مکالمے تحریر کیے ہیں۔ ڈرامے کے تین بنیادی کردار نسیم، سعید اور شہاب ہیں۔ منٹو نے اس ڈرامے میں اس دور کے مخدوش معاشی وسماجی حالات کے تناظر میں ایک انسان کی زندگی پر مرتب حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ڈرامے کا انجام منفی ہے کہ اس کا ایک کردار حالات کے زیر اثر خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے۔

دسمبر 1935 کے شمارے میں ”محبت اور زندگی“ کے عنوان سے نثر میں نظموں پر ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کی ابتدا میں منٹو نے لکھا ہے کہ منثور اشعار لکھنے کا خیال سب سے پہلے طالسطائی کے دماغ میں پیدا ہوا تھا۔ اس مضمون میں منٹو نے ایک جاپانی شاعر مسٹر بونی لیوگوشی کی نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ اردو میں نثری نظم کی شروعات کہی جاسکتی ہیں اور اس میں منٹو کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ مضمون مختصر صورت اور نئے عنوان کے ساتھ ”شاعر“ ممبئی کے سالنامہ 1935 میں صفحہ 18 تا 20 بھی شائع ہوا تھا۔ انطون چیخوف پر منٹو کا مضمون جنوری 1936 میں شائع ہوا۔ اس میں منٹو نے چیخوف کے فن پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ اس دور میں افسانہ نگاری کے رموز اور روسی معاشرے کے مسائل کا بھی تجزیہ کرتا ہے اور وہ وکٹر ہیوگو کے تمام مشہور ڈراموں کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔ اس کی کہانی اور کرداروں کو بھی زیر بحث لاتا ہے۔ آخر میں وہ اس کے ایک شاہکار ”مصیبت زدہ“ کا تفصیلی تذکرہ کرتا ہے اور وکٹر ہیوگو کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ وہ اس کے ایک کردار زین ویلزین کا تقابل ’الہلال“ میں شائع ہونے والے واقعہ کے کردار جنید بغدادی سے کرتا ہے۔ یہ مضامین اس دور میں منٹو کی روسی اور فرانسیسی ادب سے دلچسپی اور اس پر دسترس ومطالعہ کے مظہر ہیں۔

فروری 1936 کے شمارہ میں منٹو نے چند روسی نظموں کا ترجمہ ”فکرِ احمر“ کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ سات مختصر نظموں کا ترجمہ ہے۔ اس میں شعراء کے نام درج نہیں۔ لیکن ترجمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو شاعری کے رموز سے آگاہ ہے اور بدیسی زبان کی شاعری کو اردو میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ترجمہ نہیں طبع زاد دکھائی دیتی ہیں۔

فکرِ احمر.......روسی نظمیں

برف کا گالا

کس قدر شفاف!۔۔۔۔کس قدر حسین ہو
برف کے ننھے اولے
اگر تجھے غور سے دیکھا جائے،
تو برف کی دھاریاں پگھلتی دکھائی دیں گی
اسی طرح ہمارے آخری آنسو،
کسی گذرے ہوئے غم کے لئے بہتے ہیں،
جبکہ آنے والی خوشی کا پہلا خواب طلوع ہوتا ہے۔

خزاں کا گیت

موسم گرما نے آخری سانس لیا۔۔۔مدھم پڑ گیا!
منور دن پرواز کر گئے!
برکھا سے لدی ہوئی دھند دلدلوں سے بیدار ہوئی
رات نے اپنا خواب آگیں نقاب الٹ دیا
پکے ہوئے کھیت ننگے پڑے ہیں
ندیوں کا رقصاں کھیل سرد ہے۔
بگلوں کے بال سپید ہو رہے ہیں۔
ایوانِ قدرت رنگ بدل رہا ہے
جلد... بہت جلد، سرما کی سردی
مرغزاروں اور کھیتوں کو اپنا سلام پیش کرے گی
بہت جلد جھونپڑوں اور مکانوں میں،
آگ اپنی دلکش گرمی بخشے گی!

ھنگامہ

ایک لہر دوسری لہر پر لپکتی ہے
اور شور کرتی ہوئی گزر جاتی ہے
اسی طرح انسان پر انسان، لڑھکتے ہوئے ڈھیروں کی طرح گذر جاتا ہے،
...کم مایہ انبوہ!!
لہریں مستعار حرارت پر اپنی سردی کو ترجیح دیتی ہیں۔
انسان گرمی قلب کا خواہاں ہے، لیکن...
وہ سمندر کی لہروں سے بھی زیادہ سرد ہے!!

خنجر

مجھے تجھ سے محبت ہے... اے، میرے آہنی خنجر
اے میرے رفیق... سرد اور چمکیلے
غمناک جدائی کے موقعے پر،
جب دست نازک نے تجھے بطور تحفہ پیش کیا،
صرف اُسی وقت خون کی سرخ بوندوں کی بجائے،
تیری دھار پر چمکتا ہوا آنسو... اُلفت کا بے بہا موتی نظر آیا!!
مجھ پر جمی ہوئی سرمگیں آنکھیں،
ایک نہاں غم میں ڈوبی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں
جیسے تیرا پھل شعلوں کی سرخ زبانوں سے کھیل رہا ہے
وہ شعلے جو کبھی مغموم تاریکی سے نکل کر پھر بھڑک اٹھتے ہوں

فروری 1936 کے ”کنول“ میں اس کے ایڈیٹر منظر اکبرآبادی نے صفحہ 62 پر منٹو کی دو کتابوں پر نقد ونظر کے عنوان سے تبصرہ بھی کیا۔ کتاب دو ڈرامے کے حوالے سے لکھتے ہیں یہ روس کے مشہور ومقبول مصنف انطون چیخوف کے دو مشہور ڈرامے ہیں جن کا ترجمہ مسٹر سعادت حسن منٹو نے کمال حسن وخوبی کیا ہے۔ سعادت صاحب اپنے اکثر تراجم اور مضامین کی وجہ سے کافی مشہور ہو چکے ہیں اور نوجوان لکھنے والوں میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ چیخوف کے ان مزاحیہ ڈراموں کا ترجمہ بھی آپ نے بہت اچھا کیا ہے اور دنیائے ادب کے لیے ان کی یہ پیش کش بہ نظر استحسان و افادہ دیکھے جانے کے قابل ہے۔ دوسری کتاب ”آتش پارے“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”سعادت صاحب نے افسانہ نگاری میں اچھا ملکہ حاصل کیا ہے اور جہاں وہ بے تکان ترجمہ کرنے میں کامیاب ہیں، وہاں طبع زاد افسانے بھی خوب لکھتے ہیں۔ اس کتاب کا ہر فسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے سوز وگداز میں ڈوبا ہوا اور کامیاب ہے۔ سعادت صاحب کی ادبی کوششیں اور کاوشیں قابل داد ہیں۔ آثار کہہ رہے ہیں کہ ایک نہ ایک دن دنیائے ادب میں وہ کوئی خاص شخصیت حاصل کر کے رہیں گے۔ ہم اپنے ہونہار مصنف کے لیے دعا گو ہیں۔“ ■

> **ماہنامہ ”کنول“ میں منٹو کی ابتدائی تحریر ایک خط ہے جو ستمبر 1935 کے شمارہ میں صفحہ 4 پر شائع ہوا ہے۔ یہ خط منٹو نے علی گڑھ سے لکھا ہے۔ یہ وہ دور تھا۔ جب منٹو مختصر دورانیہ کے لیے 1935 میں علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ اس وقت وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے ہاسٹل کے کمرہ نمبر 111، ایس ایس ایسٹ میں مقیم تھا۔ بعد ازاں منٹو نے مختارالدین آرزو کے نام ایک خط میں اولڈ علیگ ہونے پر فخر اور خوشی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں سے انہوں نے ایڈیٹر کو ”کنول“ کی اشاعت پر مبارکباد اور اس میں چھپنے والی تحریروں کے متعلق پسندیدگی کا خط تحریر کیا ہے۔**

حواشی: (1) منظر صدیقی اکبرآبادی شمشاد حسین منظر صدیقی اکبرآبادی، علامہ سیماب اکبرآبادی کے خلف اکبر تھے۔ منظر نے 1933 میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ رسالہ ”پیمانہ“ اور ”تاج“ آگرہ کے ناظم رہے۔ 1930 میں ”شاعر“ کا اجراء کیا گیا تو منظر صدیقی اس کے مدیر مقرر ہوئے اور کئی سال تک شاعر کو نکھارتے رہے۔ ماہنامہ ”ثریا“ اور مشورہ کے بھی ایڈیٹر رہے۔ ماہ نامہ ”کنول“ آگرہ 1935 میں اپنی ادارت میں جاری کیا۔ منظر صاحب کے ساتھ ضیا فتح آبادی بھی ادارت میں شامل تھے اور سعادت حسن منٹو کا بھرپور تعاون بھی حاصل تھا۔ منظر صدیقی کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا تاہم افسانوں کے چھوٹے بڑے مجموعے ”عبرت کے آنسو“، دوست، لالہ زار اور ایک کتاب عام فہم عروض کے نام سے شائع ہوئی۔

ہاؤس نمبر 10، اسٹریٹ نمبر 3، بلاک ای انیکریج
پوسٹ آفس سہالہ ، اسلام آباد (پاکستان)
03335261472